© rasailojaraid.com

علومِ اسلامیہ کی اشاعت میں ہندوستانی مدارس کا کردار
(ایک تاریخی جائزہ)

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی

مسجد کو مرکز علم بنا کر تعلیم کا جو آغاز عہد نبوی میں مسجد نبوی میں قائم چبوترہ (جسے صفّہ کہا جاتا ہے) سے ہوا تھا، اس کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری تک جاری رہا اور مساجد کے ذریعے تعلیمی سرگرمیاں انجام دی جاتی رہیں۔ اس کے اثرات ہندوستان پر بھی پڑے۔ محمد بن قاسم (۹۳-۹۶ھ/ ۷۱۱-۷۱۴ء) نے جب سندھ پر حملہ کیا تو کئی مقامات پر مساجد کی تعمیر کی، جو آگے چل کر تعلیم و تعلم کے عظیم مراکز بن گئیں۔ یہی صورت حال ہندوستان کے جنوبی حصے کی بھی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ (م ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا، خشکی سے اور تری سے۔ خشکی کا راستہ درّۂ خیبر کا تھا جہاں سے ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز سے داخل ہونا شروع کیا، لیکن ان سے صدیوں پہلے اہل عرب تاجر اور سوداگر سندھ اور ملیبار (مالابار) سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم بھی لائے اور سالہا سال پہلے کہ اسلام کا کوئی تیغ زن سپاہی اس سرزمین پر قدم رکھے، یہاں مسلمان عربوں اور عراقیوں کی نوآبادیاں قائم ہو چکی تھیں اور مسجدیں تعمیر اور آباد تھیں۔ یہی مسجدیں اسلام کی ابتدائی درس گاہیں تھیں، جن میں وہ بیٹھ کر 'قال اللہ و قال الرسول' کا آوازہ بلند کرتے تھے۔"[۱]

مسلمانوں نے ہندوستان میں دعوت دین کو عام کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے ان میں سے ایک تعلیم گاہوں کا قیام بھی ہے۔ یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پہنچنے کے ابتدائی زمانے سے ہی تعلیم وتدریس پر خاصا زور دیا اور ہر عہد میں جگہ جگہ بڑے بڑے دارالعلوم بھی قائم کیے۔ یہاں مسلمانوں کے ساتھ نومسلموں اور غیر مسلموں کی بھی تعلیم وتربیت کی جاتی تھی۔ اس کا اثر یہاں کے غیر مسلموں پر بھی پڑا، انہوں نے اپنے علوم کو پھیلانے میں کسی قدر سرگرمی دکھائی اور ان کے ذہن وفکر کے دریچے کھلے۔ اس طرح ان کا علم مسلمانوں کے تعاون سے دوسرے ملکوں میں پہنچنے لگا، جب کہ یہ لوگ مسلمانوں کی آمد سے قبل اپنے علوم کو چھپا کر رکھتے تھے اور ان کے بعض طبقوں کو انھیں پڑھنے پڑھانے کی اجازت نہ تھی۔[۲]

ہندوستان میں مدارس کے قیام کا آغاز

موجودہ شکل کے مدارس کے قیام کا باقاعدہ آغاز پانچویں صدی ہجری سے شروع ہوگیا تھا۔ عام خیال یہ ہے کہ نظام الملک طوسی (م ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء) نے بغداد میں ایک بڑا مدرسہ نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا۔ جب کہ دوسری روایت یہ ہے کہ اس سے قبل الپ ارسلان (۴۵۵-۴۶۶ھ/۱۰۶۳ء-۱۰۷۳ء) اور ملک شاہ (۴۶۶-۴۸۵ھ/۱۰۷۳ء-۱۰۹۲ء) کے عہد حکومت میں سلجوقی سلطنت کے مدارالمہام کی حیثیت سے طوسی کے منظر عام پر آنے سے پہلے کئی مدرسے قائم ہوگئے تھے۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی (۳۹۱-۴۱۸ھ/۱۰۰۰-۱۰۲۷ء زمانہ فتوحات) نے ہندوستان کی دولت کا ایک حصہ اس عمدہ کام میں صرف کیا۔[۳] سلطان نے غزنی میں ۴۱۰ھ/۱۰۱۹ء میں 'عروس الفلک' کے نام سے ایک خوب صورت مسجد بنوائی اور اس کے ساتھ مدرسہ کی عمارت بھی تعمیر کرائی۔ نیز مدرسہ کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی تعمیر کیا، جہاں نادر اور نایاب قسم کی کتابیں جمع کی گئیں۔ مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لیے سلطان نے بہت سے دیہات اور اراضی وقف کردیے۔[۴] بادشاہ کے اس ابتدائی اقدام کی دیگر لوگوں نے تقلید کی اور جلد ہی غزنی میں اور کئی مدارس امراء اور ارکان حکومت کی مساعی سے قائم ہوگئے۔ تاریخ فرشتہ میں ہے:

"بادشاہ کی تقلید میں امرائے سلطنت مسجدیں، مدرسے، رباطیں اور خانقاہیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے گئے"۔[۵]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غزنی میں مختصر عرصے میں اس کثرت سے مدرسوں کا قائم ہو جانے کی وجہ سے مختلف ممالک کے علم و فضل کا بڑا طبقہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ علمی سرپرستی کے ساتھ مورخین محمود غزنوی کے خود صاحبِ علم و فضل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور اسے فقہ حنفی کا عالم بتاتے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے اس کی تصنیف میں فقہ حنفی کی کتاب 'التفریذ' کا بھی ذکر کیا ہے، جس کے بارے میں کم از کم اتنا تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کی سرپرستی اور نگرانی میں لکھی گئی تھی۔ ویسے خود اس کی تصنیف ہونے میں بھی کوئی تعجب نہیں، کیوں کہ اس کے دربار میں علمی و مذہبی مباحثے ہوتے رہتے تھے اور وہ ان میں حصہ لیتا تھا۔[۶]

محمود کے انتقال کے بعد اس کے فرزند سلطان مسعود (۴۲۲-۴۳۳ھ/ ۱۰۳۰ء-۱۰۴۰ء) نے بھی عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تعلیم و تدریس کے سلسلے میں بڑی دل چسپی دکھلائی۔ اس نے اپنی مملکت میں کثرت سے مدارس قائم کیے۔ فرشتہ لکھتا ہے:

''اپنے عہد حکومت کے شروع میں اس نے ممالک محروسہ میں اس قدر مدرسے اور مسجدیں بنوائیں کہ ان کی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز و قاصر ہے۔''[۷]

مولانا عبدالحی الحسنی نے لکھا ہے کہ: ''سلطان مسعود اپنے باپ محمود غزنوی کے طرز عمل پر قائم رہا۔ ابوالریحان البیرونی (م ۴۶۹ھ/ ۱۰۷۷ء) نے 'القانون المسعودی' اور قاضی محمد الناصحیؒ نے فقہ حنفی میں 'الکتاب المسعودی' اور ابو الفضل محمد بن حسین بیہقیؒ (م ۴۷۰ھ/ ۱۰۷۷ء) نے 'تاریخ مسعودی' لکھ کر اس کی علم پروری کا اظہار کیا ہے۔''[۸]

اسی طرح سلطان رضی الدین ابراہیم (۴۵۱-۴۸۱ھ/ ۱۰۵۹-۱۰۸۸ء) نے اپنے دور حکومت میں علم و ادب کو بڑی تقویت پہنچائی۔ اس کے بیٹے علاء الدین مسعود (م ۵۰۸ھ/ ۱۱۱۵ء) نے بھی علوم اسلامیہ کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ معزالدین بہرام شاہ کے عہد میں مولانا نظامی نے 'مخزن الاسرار' لکھ کر اسی بادشاہ کے نام معنون کیا۔ 'کلیلہ و دمنہ' کا ترجمہ بھی اسی عہد میں عربی سے فارسی میں ہوا۔ اسی عہد میں ایک بزرگ شیخ محمد اسمٰعیلؒ لاہور میں وارد ہوئے۔ وہ حدیث و تفسیر کے بڑے عالم تھے۔ بڑی تعداد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔انہوں نے ایک عرصے تک تعلیم و تدریس کا شغل جاری رکھا۔۴۴۸ھ/ ۱۰۵۶ء میں لاہور ہی میں ان کا انتقال ہوا۔۹

عہدِ غوری کی علمی سرگرمیاں

محمود غزنوی سے لے کر شہاب الدین کے حملۂ ہند تک لگ بھگ دوسو سالوں کا زمانی بعد ہے۔اس درمیان میں بالخصوص مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لیے جو ادارے قائم ہوئے ہوں گے ان کی تعداد خاصی رہی ہوگی۔کیوں کہ اس عہد میں جن مشہور علماء کا ذکر تاریخی کتابوں میں ملتا ہے، ان سے تدریسی خدمات لینے کے لیے صرف مساجد کے صحن کافی نہ تھے، بلکہ مدارس کا قیام بھی ضروری تھا۔بعض تاریخی کتابوں میں فروغ تعلیم کے سلسلے میں شہاب الدین کی جدوجہد کا تذکرہ اس انداز میں کیا گیا ہے:

''وہ ایک بڑا جنگ جو تو تھا ہی،اسی کے ساتھ وہ علوم فنون کا مربی بھی تھا۔اس نے ۵۸۷ھ/ ۱۱۹۱ء میں اجمیر فتح کیا اور وہاں متعدد مساجد اور مدارس تعمیر کروائے۔اس کے عہد کی مشہور علمی شخصیت امام حسن بن محمد صغانیؒ غزنوی لاہوری (م ۶۳۵ھ/۱۲۳۷ء) کی 'مشارق الانوار' اور 'الحیات الزاخر' نے ہندوستانی مسلمانوں کا نام عرب مماک میں اونچا کیا۔''۱۰

عہدِ غلامان میں تعلیمی اداروں کا قیام

سرزمین ہند میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام ودوام کا سہرا شہاب الدین غوری (۵۷۱-۶۰۲ھ/ ۱۱۷۵-۱۲۰۶ء زمانہ فتوحات وحکومت) کے غلام قطب الدین ایبک (۶۰۲-۶۰۷ھ/ ۱۲۰۶-۱۲۱۰ء) کے سر جاتا ہے۔اس کے اندر دینی حمیت پوری طرح موجود تھی اور شریعت سے حد درجہ لگاؤ تھا۔اس کے تعلقات علماء سے بڑے اچھے تھے۔اس نے علماء کبار ومحدثین عظام کی سرپرستی کی۔اس دینی حمیت اور علماء نوازی کا اثر تعلیمی نظام پر بھی پڑا۔بقول صدرالدین حسن نظامی: ''ہر سو میں نوے آدمی عالم اور ہر دس میں نو مفسر قرآن تھے۔''۱۱ اس کی مساعی سے متعدد تعلیمی ادارے کا قیام عمل میں آیا، اگرچہ ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی یقینی شہادت نہیں ملتی، سوائے دو چند مدارس کی تعمیر کے۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ قطب الدین ایبک نے مدرسے تو ضرور قائم کیے، مگر افسوس ہے کہ ان مدرسوں کے نام باقی نہیں اور یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس درجے کے تھے۔ ۱۲؎ جب کہ دوسرے تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے سلطنت کے مختلف حصوں میں متعدد مسجدیں تعمیر کرائیں، جن میں قرون وسطی کے کلیساؤں کی طرح دینوی تعلیم کا بھی اسی طرح انتظام تھا جس طرح دینی تعلیم کا تھا۔ ۱۳؎

عہد قطبی میں سب سے پہلے جس تعلیمی ادارہ کے قیام کی شہادت ملتی ہے وہ ناصر الدین قباچہ (م ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) کا تعمیر کردہ ہے، اسے ملتان میں مولانا قطب الدین کاشانیؒ کے لیے بنوایا گیا تھا۔ اسی مدرسہ میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ (۵۷۸-۶۶۱ھ/۱۱۸۲/۱۱۸۳-۱۲۶۲ء) نے تعلیم پائی تھی۔ ۱۴؎

قطب الدین ایبک کا معتمد وزیر بختیار خلجی سلطنت دہلی سے کافی دور بنگال میں فاتحانہ شان سے داخل ہوا اور قدیم شہر 'ندیا' کی جگہ 'رنگ پور' کے نام سے نیا شہر آباد کیا اور وہاں مسلمانوں کو بسا کر ان کے لیے بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ ۱۵؎

ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) کے اوائل میں جس مدرسہ کا ذکر تاریخی کتابوں میں کثرت سے ملتا ہے وہ مدرسہ 'معزی' ہے، جسے سلطان التمش/ ایلتتمش (۶۰۸-۶۳۳ھ/ ۱۲۱۱-۱۲۳۶ء) نے قائم کیا تھا۔ اسی نام سے بدایوں میں بھی ایک مدرسہ قائم ہوا تھا۔ دونوں مدرسے سلطان معز الدین کے نام سے تھے۔ التمش سلطان معز الدین کی بے حد عزت کرتا تھا۔ مگر رضیہ سلطانہ (۶۳۴-۶۳۷ھ/ ۱۲۳۶-۱۲۳۹ء) کے زمانہ میں اس مدرسہ کی بربادی قرامطہ کے ہاتھوں ہوگئی، جس کو بعد میں فیروز شاہ نے ازسرنو تعمیر کرایا اور اس میں صندل کے دروازے لگوائے۔ ۱۶؎ اس مدرسہ کے ایک مدرس مولانا بدرالدین اسحاق بخاریؒ تھے، جو معقول و منقول میں اپنے وقت کے یکتائے روزگار تھے۔ ۱۷؎

اس عہد کی علمی و دینی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں: ''سیاسی اعتبار سے جہاں اس کا عہد تاریخ ہند میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے وہاں مذہبی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور علمی حیثیت سے بھی اس کا عہد نہایت تاب ناک ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی ادارہ کی داغ بیل اور نشو ونما اس کی کوششوں کا رہین منت ہے۔''۱۸

سلطان التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود (۶۴۴-۶۶۴ھ/ ۱۲۴۶-۱۲۶۵ء) کے عہد میں بھی ایک بڑے مدرسے کے قیام کا پتہ چلتا ہے، جو اسی کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ بادشاہ خود بھی بڑا متقی، دین دار اور صاحب علم وفضل تھا۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدرسہ نے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل کی تھی۔ اس کے مہتمم اور وقف کے نگراں مولانا منہاج الدین سراج عثمانیؒ مقرر ہوئے تھے، جو طبقات ناصری کے مصنف بھی ہیں۔۱۹

اسی عہد میں علاقہ جالندھر میں بھی ایک بڑے مدرسے کے قیام اور اس کی خدمات کا پتا چلتا ہے، جہاں اس کے وزیر اعظم بلبن اور اس کے رفقاء نے کسی مہم سے کامیاب واپسی پر عید الاضحیٰ کی نماز پڑھی تھی۔۲۰ بعد میں یہ وزیر خود ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۶ء میں سلطنت دہلی کا بادشاہ بنا اور ۶۸۶ھ/ ۱۲۸۷ء تک حکومت کرتا رہا۔

عہدِ خلجی کے تعلیمی ادارے

جلال الدین فیروز خلجی (۶۸۹-۶۹۵ھ/ ۱۲۹۰-۱۲۹۵ء) کا عہد ہندوستان میں علمی ترقیوں کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا۔ جلال الدین خود ایک بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ وہ اپنی مجلسوں میں اکثر علم وفن کے بڑے بڑے باکمال لوگوں کو بلاتا اور ان کے علمی مباحثے بڑے شوق اور توجہ سے سنتا تھا۔ اس کی عنایت خاص اور بے لوث فیاضی نے اس کے دربار میں ایک علمی فضا قائم کردی تھی اور تمام اطراف ونواح میں اس کی فیاضی اور علم دوستی کی شہرت پھیل گئی تھی۔ اس کی سرپرستی میں جن لوگوں نے تاریخ، فلسفہ، شعر وادب اور دوسرے علوم پر تصانیف تیار کیں ان میں ملک الشعراء امیر خسروؒ، خواجہ حسنؒ، تاج الدین عراقیؒ، امیر ارسلان، سعد الدین منطقی، اختیار الدین یاغی اور قاضی مغیث جیسے لوگ تھے۔ دوسرے فرائض کے علاوہ امیر خسرو کے ذمہ شاہی کتب خانہ کا اہتمام بھی تھا۔ سلطان ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس نے انہیں سفید لباس پہننے کا اعزاز عطا کیا تھا، جو صرف خاندان شاہی اور بلند پایہ امرا کا امتیاز تھا۔۲۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاء الدین محمد خلجی (۶۹۵-۷۱۵ھ/ ۱۲۹۵-۱۳۱۵ء) اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا، مگر وہ علم اور علماء کی بڑی قدر کرتا تھا۔ فرشتہ کے مطابق کم وبیش ۴۶/ علماء اور فضلا ایسے تھے جو اس کے عہد میں مدرسوں میں اساتذہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔[۲۲] علائی دروازہ کی جنوبی سمت میں جو کتبہ ہے اس میں سلطان کو علم اور دین کے ستون کو قوت دینے والا اور مدرسوں اور عبادت گاہوں کو تقویت پہنچانے والا مرقوم ہے۔[۲۳] اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے عوام کی تعلیم وتربیت پر کتنی محنت کی ہوگی۔ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں بے شمار مدرسے، مسجدیں، خانقاہیں، حمام اور مقبرے تعمیر ہوئے۔[۲۴] اس کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے جو مدارس تعمیر کروائے وہ کس نام سے تھے اور بادشاہ نے ان مدرسوں کو کن بزرگوں کے نام سے معنون کیا تھا؟

'مدرسہ ومقبرہ علاء الدین خلجی' جو مدرسہ قوۃ الاسلام اور قطب کی لاٹ کے متصل واقع تھا، سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی (۷۱۶-۷۲۰/ ۱۳۱۶-۱۳۲۰ء) نے تقریباً ۷۱۷ھ/ ۱۳۱۷ء میں بنوایا۔ مقبرہ، مدرسہ اور مسجد سب کی مرمت فیروز شاہ نے اپنے عہد حکومت میں کی، صندل کے چھپر کھٹ چڑھائے۔[۲۵]

عہدِ تغلق میں مدرسوں کا قیام واستحکام

محمد شاہ تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ/ ۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) نے عوام کی تعلیم وتربیت میں خاصی دل چسپی لی۔ اس نے مکتبوں میں ہزاروں علماء وفقہاء درس وتدریس کے لئے مقرر کیے، جو بچوں کو پڑھاتے تھے اور انہیں شاہی خزانہ سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کی درس گاہیں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ مورخین نے علم وادب میں اس کی گہری دل چسپی کی شہادت دی ہے۔[۲۶]

فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ/ ۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) نے نہ صرف پرانے مدرسوں کی، جو بہت خراب اور خستہ حالت میں پڑے ہوئے تھے، مرمت اور ان کی دوبارہ تعمیر کرائی، بلکہ بہت سے نئے مدرسے بھی قائم کیے۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق اس نے اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مملکت میں تیس مدرسے قائم کیے اور ان میں لائق وفائق اور باتنخواہ اساتذہ رکھے۔ جب کہ عبدالباقی خاں نے مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ اس نے پچاس مدرسے کھلوائے۔ ۲۷ فیروز شاہ کی علمی سرگرمیوں کا ذکر اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس طرح کیا گیا ہے:

"تغلق خاندان میں فیروز شاہ تغلق علم پرور، علم دوست، علماء کا قدرداں اور سرپرست تھا۔ وہ خود بھی تصنیف وتالیف سے شغف رکھتا تھا۔ اس نے اپنی خودنوشت سوانح 'فتوحات فیروز شاہی' کے نام سے لکھی ہے۔ فیروز شاہ نے ۷۵۳ھ/ ۱۳۵۲ء میں ایک مدرسہ فیروز آباد میں قائم کیا، جس کے متصل مسجد بھی تھی۔ ضیاء برنی نے اس مدرسے کی بڑی تعریف کی ہے۔ دوسرا مدرسہ بالا بند آب سیری تھا جو ایک شاہی عمارت میں واقع تھا...... اس نے رفاہ عامہ کے جو ادارے قائم کیے تھے، جن میں مدارس بھی تھے، ان کی تفصیل فتوحات فیروز شاہی میں ص ۳۸۲ تا ۳۸۴ مذکور ہے۔" ۲۸

ان میں سب سے عظیم الشان وہ مدرسہ تھا جو 'مدرسہ فیروز شاہی' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس مدرسہ کی تفصیلات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان بادشاہ کے نزدیک ایک تعلیمی ادارے کے کیا مقاصد تھے اور اس کا اندرونی نظام کیسا تھا؟ یہ ایک بڑا اور وسیع محل تھا جس کے چاروں طرف نہایت عمدہ باغات تھے اور اس کے اندر باہر سے آنے والے معزز مہمانوں کے لیے، جن کی اکثر آمد ہوا کرتی تھی، علیحدہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک اقامتی درس گاہ تھی، جس کے ساتھ غریب طلبا اور اساتذہ کے رہنے کا بھی انتظام تھا۔ اس میں ایک مسجد اور پانی کا حوض بھی بنوایا گیا تھا۔ ۲۹ اس مدرسہ کے منتظم وناظم مولانا جلال الدین رومیؒ تھے۔

دہلی میں ایک اور مدرسہ 'حوض خاص' کے نام سے مشہور تھا۔ حوض دراصل سلطان خلجی کا بنوایا ہوا تھا۔ اسے اس نے اپنی تخت نشینی کے سال ۶۹۶ھ/ ۱۲۹۷ء میں بنوایا تھا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں یہ حوض مٹی سے بھر گیا تھا۔ بادشاہ نے اس کو صاف کروایا اور جہاں جہاں مرمت کی ضرورت تھی کرائی۔ تقریباً ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء میں اس نے اس کے اوپر ایک مدرسہ قائم کیا اور اس میں مشہور مدرسین جمع کیے۔ اس مدرسہ کے صدر مدرس سید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوسف بن جمال حسینیؒ تھے، جن کا انتقال ۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء میں ہوا اور اسی مدرسہ کے صحن میں دفن کیے گئے۔[۳۰]

فیروز شاہ تغلق نے اپنے عزیز بیٹے اور ولی عہد فتح خاں کی یادگار میں ایک اور مدرسہ قائم کیا تھا، جس کے ساتھ ایک مسجد اور تالاب بھی تھا۔[۳۱] اس مدرسہ کے اخراجات کا مدار شاہی وظائف پر تھا۔

فیروز شاہ کے عہد میں شاہی خزانے کی ایک بڑی رقم غلاموں کی تعلیم و تربیت پر صرف ہوتی تھی۔ ان کی بہبود کے کاموں کے لیے جو عملے اور افسران مقرر تھے ان کا ایک علیٰحدہ محکمہ تھا اور ان کی پنشن اور وظائف مقرر تھے۔ ان غلاموں کی تعداد ۱,۸۰,۰۰۰ کے قریب تھی اور کوئی فن اور ہنر ایسا نہ تھا جس میں ان کی تربیت کا انتظام نہ کیا گیا ہو۔ ایک وقت میں ۱۲/ ہزار ماہرین فن نکالے جاتے تھے۔[۳۲]

سلاطینِ لودھی کی علمی دل چسپی

سلطنت لودھی میں بھی تعلیم و تعلم کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ سلطان سکندر لودھی (۸۹۴-۹۲۳ھ/ ۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) نے آگرہ کو دارالسلطنت بنانے کے بعد پورے شہر اور قرب و جوار میں علم و فن کو ترقی دی، جس کی وجہ سے شہر دہلی کی رونق ماند پڑ گئی۔ اس نے وہاں جو عالی شان عمارت بنوائی اس میں مدرسے بھی قائم کیے۔ اس کی علمی فیاضی کو دیکھ کر عرب، ایران اور بخارا سے علماء و فضلا آنے لگے۔ اس کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصہ میں آگرہ ایک بڑا تعلیمی مرکز بن گیا۔ ابو الحسنات ندویؒ نے لکھا ہے کہ ''سکندر لودھی نے اپنے ایام حکومت میں بہ کثرت سرائیں، مدرسے اور مسجدیں بنوائیں، متھرا میں اس نے متعدد مدارس قائم کیے۔''[۳۳] بادشاہ کی علمی دل چسپی اور علماء پروری کا تذکرہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''لودھی خاندان کا گل سرسبد سلطان سکندر لودھی تھا۔ اس کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی زبان کی طرف توجہ کی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ مکاتب و مدارس میں تعلیم پانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگے۔اسی زمانے میں سید رفیع الدین شیرازیؒ گجرات سے دہلی وارد ہوئے۔موصوف معقولات میں محقق دوانی اور حدیث میں حافظ سخاویؒ کے شاگرد رشید تھے۔انہوں نے آگرے میں سکونت اختیار کر کے درس وتدریس کا بازار گرم کیا اور ایک عالم کو اپنے فیوض وبرکات سے مستفید کیا۔‘‘[۳۴]

مولانا عبداللہ تلنبیؒ جب لاہور کی بربادی کے بعد دہلی پہنچے تو سکندر لودھی نے ان سے دہلی میں قیام کرنے کی درخواست کی۔مولانا نے یہاں قیام کر کے نہ صرف جدید تعلیمی نصاب مرتب اور اسے مدرسہ کے نصاب میں شامل کیا، بلکہ ایک مدرسہ بھی تعمیر کیا،جس کا نام ’مدرسہ عبداللہ تلنبیؒ‘ رکھا گیا۔آپ سے خلق کثیر نے استفادہ کیا۔’بدیع المیزان‘ اور’شرح میزان‘ آپ کی تصنیفات ہیں۔ان کے انتقال ۹۲۲ھ/۱۵۵۶ء کے بعد سکندر لودھی کے رہبر شیخ بہوہ نے شاہ عبدالرزاق جھنجھانویؒ کو اس مدرسہ میں درس وتدریس کے لیے مامور کیا۔[۳۵]

عہدِ ہمایونی کے تعلیمی ادارے

ہمایوں (۹۳۷-۹۶۳ھ/۱۵۳۰-۱۵۵۶ء درمیان میں کچھ وقفہ) نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ایک مدرس شیخ حسینؒ تھے۔لوگوں کو عام طور پر معلوم نہیں کہ ہمایوں کے مقبرہ کے اوپر جو چھت تھی وہ دراصل ایک مدرسہ تھا،جس میں بڑے بڑے اساتذہ وقت تعلیم دیتے تھے اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلبہ کی اقامت کے لیے بنے ہوئے تھے۔[۳۶] یہ مدرسہ دہلی مدرسہ کے نام سے مشہور تھا۔اسی طرح شیخ زین الدین خانی نے ایک مدرسہ دہلی میں تعمیر کیا تھا،ان کے انتقال کے بعد بطور ایصال ثواب آگرہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔[۳۷]

دہلی کے علاوہ نظام الدین کی سڑک کے بائیں طرف مدرسہ ’خیر المنازل‘ کی عالی شان اور وسیع عمارت تھی۔یہاں ایک مسجد بھی تھی۔یہ مدرسہ اور مسجد اکبر بادشاہ کی رضاعی والدہ ماہم بیگم (جو ادھم خاں کی سگی ماں تھی) نے ۹۶۹ھ/۱۵۶۲ء میں تعمیر کرائی تھی[۳۸]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اسے نہایت ساز وسامان اور لائق اساتذہ سے آراستہ کرایا تھا۔ ۳۹ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) نے 'اخبار الاخیار' میں غالباً اسی مدرسہ کا ذکر کیا ہے، جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی۔ ۴۰

اس عہد میں ایک اور مدرسہ دہلی میں تھا جو 'خواجہ معین الدین' کا مدرسہ کہلاتا تھا۔ اس میں طلبا کی تعلیم کے لیے ماہر اساتذہ رکھے گئے تھے۔ ایک استاد مرزا مفلس سمرقندیؒ بھی تھے جو اس مدرسہ میں تین سال (۹۷۹-۹۸۲ھ/ ۱۵۷۱-۱۵۷۴ء) تک کام کرتے رہے۔ ۴۱

عہدِ اکبری میں تعلیم وتدریس کی ترقی

مغل بادشاہ اکبر (۹۶۳-۱۰۱۴ھ/ ۱۵۵۶-۱۶۰۵ء) نے فتح پور سیکری اور اس کے ارد گرد کے علاقے میں اپنی رعایا کی خوش حالی اور عمدہ تعلیم وتربیت کے لیے بہتر اقدامات کیے۔ اس کے حکم سے تدریس کے طریقے میں بھی تبدیلی کی گئی اور بچوں کو منصوبہ بند طریقے سے تعلیم دینے کا رواج شروع ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ (۱۳۰۶-۱۳۷۸ھ/ ۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) اس عہد میں علما کی کثرت اور ان کے فیوض وبرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس عہد کے ہندوستان میں بجز عالموں اور پیروں کے کوئی نہیں بستا، کوئی شہر وقریہ نہ تھا کہ خانقاہوں اور مدرسوں سے خالی ہو۔'' ۴۲ خود بادشاہ نے فروغ تعلیم کے سلسلے میں جو اقدامات کیے اس کے متعلق عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

''اکبر نے اپنی ہندو اور مسلم رعایا کی تعلیم کا انتظام شاہان سابق سے بہت بڑھ چڑھ کر کیا۔ قلم رو کے مکاتب و مدارس میں ہندو اور مسلم طالب علم اکٹھے پڑھتے تھے۔ فارسی پڑھانے کا انداز اس قدر صحیح اور سائنٹفک تھا کہ چند ہفتوں کے اندر طالب علم فارسی نثر ونظم روانی سے پڑھ سکتا تھا۔ باعتبار علوم تعلیم کی ترتیب یہ تھی: اخلاق، ریاضی، حسابات، زراعت، ہندسہ، ہیئت، علم الارض، معاشیات، سیاست ملکی، طبیعیات، منطق، فلسفہ، فطرت، مجرد ریاضیات، دینیات اور تاریخ۔ ہندو طلبا ویاکرن (صرف ونحو) ویدانت اور پاتنجلی پڑھتے تھے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ نظام تعلیم میں تبدیلیوں کی وجہ سے مکاتب و مدارس قلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رو کے لیے زیب وزینت کا سامان بن گئے تھے۔آئے دن قلم رو کے مختلف حصوں میں نئے نئے مکاتب اور بڑے بڑے مدرسے قائم کیے جارہے تھے۔فتح پور سیکری کی پہاڑی پر اکبر نے ایک اتنا بڑا مدرسہ قائم کیا کہ سیاح کوئی نظیر نہ پیش کرسکتے تھے۔اس کے علاوہ شہر میں بے شمار دوسرے مدرسے بھی تھے، جو شہنشاہ کے حکم سے بنائے گئے تھے۔آگرہ میں بہت سے مدرسے تھے جن میں تعلیم وتدریس کے لیے شیراز سے معلمین طلب کیے جاتے تھے، کیوں کہ شیراز اس زمانے میں مسلمانوں کے علوم کا مشہور مرکز تھا''۔[۴۳]

عہدِ جہاں گیری کے مدرسے

جہاں گیر (۱۰۱۴-۱۰۳۷ھ/۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) نے اپنے عہد میں ایک عام حکم جاری کیا کہ جو امیر یا دولت مند سیاح لاوارث فوت ہوجائے اس کی املاک متروکہ بحق شہنشاہ ضبط کرکے اسے مدرسوں اور خانقاہوں کی تعمیر ومرمت پر صرف کیا جائے۔[۴۴] اس فرمان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مدارس ومکاتب کی تعمیر وترقی میں کتنی دلچسپی لیتا تھا۔

جہاں گیر نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے لیے ان کے نام سے ایک مدرسہ بنایا اور باضابطہ طور سے اس کے لیے زمین وقف کی۔ شیخ نے اس میں مدتوں درس دیا۔ ان کے بعد ان کی اولاد میں مفتی نور الحق صاحبؒ، شیخ علی صاحبؒ، شیخ محمد ہاشم صاحبؒ اور ان کے نواسے ابو رضا بن اسمعیلؒ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس میں سلسلہ وار درس جاری رکھا۔ ہر دور میں اس مدرسہ سے علماء کی ایک جماعت نے سند حاصل کی ہے۔[۴۵]

جہاں گیر کے عہد میں یقیناً اور بھی مدرسے قائم ہوئے ہوں گے اور پرانے مدرسوں کی کفالت شاہی اخراجات سے ہوتی ہوگی، مگر اس سلسلے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ ان کے علاوہ عوام بھی مدارس کی تعمیر کے لیے جدو جہد کرتے تھے اور ان کے اخراجات کی کفالت کرتے تھے۔جیسا کہ تاریخِ شاہ جہاں کا مصنف لکھتا ہے:

''عہد جہاں گیر میں ہر شہر اور گاؤں میں مدرسے تھے۔یقیناً یہ مدرسے سرکاری امداد کے پروردہ نہ تھے ۔ضرور ہے کہ ان کا وجود مقامی وذاتی کاوشوں کا رہین منت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگا۔علاوہ بریں اس دور میں تعلیم دنیوی جدو جہد کے دائرہ سے بالکل باہر سمجھی جاتی تھی ۔یہ کام گوشہ نشیں عابدوں کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔یہ بزرگان دین تعلیم مفت دیتے تھے یا نام نہاد اجرت لیتے تھے۔مذہبی رہ نماؤں کے قائم کردہ تعلیمی ادارے لاہور،احمد آباد، برہان پوراور جون پورمیں پائے جاتے تھے۔'' ۴۶

اس عہد کی علمی سرگرمیوں کا اندازہ شیخ احمد سرہندی مجددالف ثانیؒ (۹۷۱-۱۰۳۴ھ/ ۱۵۶۴-۱۶۲۴ء) کی تحریک سے بھی لگایا جاسکتا ہے ۔ انہوں نے بڑی تعداد میں اپنے خلفاء کوملک کے مختلف حصوں میں اور بیرون ملک روانہ کیا، جنہوں نے تعلیم وتدریس اور تربیت خلق کومقصدزندگی بنایا۔یقیناً ان میں کچھ لوگوں نے مدرسوں کا رخ کیا ہوگا اور کچھ لوگوں نے تعلیمی ادارے قائم کیے ہوں گے۔خود مجدد الف ثانی نے جہاں گیر سے عہد لیا تھا کہ وہ شریعت اسلامی کوسلطنت میں فروغ دینے کی کوشش کرے گا۔۴۷ اس عہد کا بھرم رکھنے کے لیے بادشاہ نے قابل قدر امورانجام دیے ہوں گےاور بڑی تعداد میں مدارس ومکاتب اورمساجد کی تعمیر کی ہوگی اوران میں لائق وفائق علمااوربزرگان دین کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

مدرسوں کے قیام واستحکام سے شاہ جہاں کی دل چسپی

شاہ جہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۸ھ/ ۱۶۲۷-۱۶۵۸ء) نے مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی تعمیر کروائی۔مسجد فتح پوری کا مدرسہ اسی دور کے باقیات صالحات میں سے ہے۔ مسجد اکبر آبادی، جو حوادث روزگار کی نذر ہوگئی اسی میں شاہ عبد القادر دہلویؒ (۱۱۶۷-۱۲۳۰ھ/ ۱۷۵۳-۱۸۱۴/۱۵ء) کا قیام رہا۔مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ(م۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) اور مولانا فضل حق خیر آبادیؒ (م۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے اسی مسجد میں تحصیل علم کی تھی۔ ۴۸

شاہ جہاں نے ۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹ء میں جامع مسجد دہلی کے قریب شمالی رخ پر شاہی شفاخانہ قائم کیا، جس کا نام ' دارالشفا' رکھا۔ یہاں غربا اور مساکین کے علاج کے تمام اسباب مفت مہیا کیے جاتے تھے۔مسجد کے جنوبی رخ پر اس نے ایک شاہی مدرسہ قائم کیا، جس کا نام ' دارالبقاء' تھا۔اس کا سال بنا تخمیناً ۱۰۶۰ھ/ ۱۶۴۹ء ہے۔۴۹ اسی مدرسہ کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفتی صدرالدین آزردہ (م ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) نے دوبارہ زندہ کیا اور اس کے اخراجات بھی اپنے ذمے رکھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں نے ان کی جائیداد ضبط کر لی تو یہ مدرسہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔۴۹؎

عہد شاہ جہانی میں سیال کوٹ بھی علوم دینیہ کا بڑا مرکز تھا۔ یہیں مولانا عبدالحکیم سیال کوٹیؒ (م ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۶ء) کا مدرسہ تھا، جو سب سے زیادہ مشہور تھا، اس کے مصارف کے لیے شاہ جہاں نے کئی گاؤں وقف کر دیے تھے۔۵۱؎

شاہ جہاں کے اندر شروع سے ہی دینی حمیت اور شریعت کی پاس داری بڑی حد تک موجود تھی۔ اس کے عہد میں جگہ جگہ مدارس قائم تھے اور علماء مسند درس بچھائے ہوئے تھے۔ اس عہد کی علمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ لکھتے ہیں:

"شاہ جہاں کے عہد میں سرہند، تھانیسور اور انبالہ میں ایسے مشہور و معروف قابل و عالم حضرات رہتے تھے جن سے اکتساب علم کے لیے دور دراز سے طالب علم آیا کرتے تھے۔"۵۲؎

اس کے علاوہ بعض شہادتوں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں جو قدیم مدرسے حوادث زمانہ کی وجہ سے چرند و پرند کے مسکن بن گئے تھے اور ان کی طرف لوگوں کی توجہ نہ ہوتی تھی، انہیں بادشاہ نے پھر سے آباد کروایا اور ان میں اچھے اچھے معلمین رکھوا کر تعلیم و تدریس کا کام شروع کیا۔۵۳؎

اورنگ زیب عالم گیر کے علمی ذوق کے اثرات

سلاطین ہند میں اورنگ زیب عالم گیر (۱۰۶۸-۱۱۱۸ھ/ ۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) کو جن خصوصیات کی بنا پر فوقیت حاصل ہے ان میں سے ایک اس کا تعلیمی ذوق بھی ہے۔ وہ خود بہت پڑھا لکھا تھا۔ اس نے اپنی رعایا کی بہتر تعلیم کے لیے پوری سلطنت میں بے شمار چھوٹے بڑے مدارس و مکاتب قائم کیے، علماء و مدرسین کو جاگیریں عطا کیں اور طلباء کے لیے وظیفے مقرر کیے۔۵۴؎ عہد عالم گیری میں دو طرح کے مدرسے تھے: ایک وہ جن کے پورے مصارف حکومت کی طرف سے ادا کیے جاتے تھے اور ان کا انتظام و انصرام بھی اسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے متعلق تھا۔ دوسرے وہ مدرسے جو ارباب خیر اور علماء دین کی کوششوں سے چل رہے تھے۔ بہتر نظام تعلیم کے لیے اورنگ زیب نے دوسرے صوبوں کے گورنروں کے نام شاہی فرامین جاری کیے جن میں رعایا کی بہتر تعلیم کی سخت تاکید کی۔۵۵ فروغ تعلیم کے سلسلے میں بادشاہ کی سرگرمیوں کا ذکر اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس انداز سے کیا گیا ہے:

''اس نے ہر طرف مدارس قائم کرنے کے علاوہ جہاں جہاں معلمین وعلماء تھے، ان کے لیے بہ کثرت مدد معاش کی رقمیں مقرر کیں۔ لاہور کی شاہی مسجد اور وزیر خاں کی مسجد مدرسے کا کام دیتی تھیں۔ وزیر خاں کی مسجد کے نیچے اور گرد و پیش جو دکانیں تھیں ان سے مدرسے کے مصارف پورے ہوتے تھے۔''۵۶

لکھنؤ میں فرنگی محل کا دار العلوم مدرسہ نظامیہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر نے ملا نظام الدینؒ (م ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۷ء) کو ایک عظیم الشان مکان عنایت کیا، جو فرنگی محل کے نام سے مشہور تھا۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں کا ترتیب دیا ہوا نصاب تعلیم تقریباً تین صدیوں سے ہندوستان کے مدارس عربیہ میں جاری ہے۔ اس مدرسہ کے علمی فیضان پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا ابوالعرفان ندویؒ لکھتے ہیں:

''نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں یہ فخر صرف اسی خاندان کو حاصل ہے کہ تقریباً ڈھائی سو برس تک بلا فصل علماء وفضلاء پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی زندگی محض علم وفن کی خدمت کے لیے وقف کر دی اور ان کی درس گاہوں سے ہزاروں علماء نکل کر ملک کے ہر گوشہ میں پھیل گئے اور الحمد للہ کہ یہ فیض اب تک جاری ہے۔''۵۷

اسی مدرسہ کے فیض یافتہ ملا حسنؒ (م ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) مولانا عبد العلی (م ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) مولانا عبد الحکیمؒ (م ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) اور آخر میں مولانا عبد الحیؒ (م ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) وغیرہ نے نہ صرف درس وتدریس کی سند کو زینت بخشی ہے، بلکہ تصانیف اور خصوصاً درسی کتابوں کی شروح وحواشی کے ذریعہ بھی بیش بہا علمی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی گونج سے مدارس عربیہ کا کوئی گوشہ خالی نہیں۔۵۸

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ/۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے والد اور فتاوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم گیری کے مرتب و مولف شاہ عبد الرحیمؒ (۱۰۵۳-۱۱۳۱ھ/۱٦۴۴-۱۷۱۸ء) نے مہندیان دہلی میں ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں 'مدرسہ رحیمیہ' کی بنیاد ڈالی، درس و تدریس کا شغل جاری کیا اور فقہ، تصوف، کلام و فلسفہ کے علاوہ قال اللہ وقال الرسول کی آواز بھی بلند کی۔ اسی درس گاہ سے ان کے لائق فرزند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور پھر وہیں درس دیا۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے مشہور و معروف جید علماء نے یہاں تعلیم پائی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء)، شاہ عبد العزیزؒ (۱۱۵۹ھ- ۱۲۳۹ھ/۱۷۴٦-۱۸۲۴ء)، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، شاہ محمد اسحاقؒ (۱۱۹۷-۱۲٦۲ھ/۱۷۸۳-۱۸۴٦ء)، شاہ عبد القادرؒ (م ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء)، شاہ محمد عاشق پھلتیؒ (م ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء)، شاہ نور اللہ پھلتیؒ، شاہ اہل اللہؒ، خواجہ محمد امین کشمیریؒ اور اخوان محمد سعیدؒ وغیرہ یہیں کے فیض یافتہ ہیں۔ یہی وہ مدرسہ ہے جہاں سے حدیث نبوی کی برکات ہندوستان کے تمام گوشوں میں پھیلیں۔ اس مدرسہ کی یادگار اب بھی دلی میں باقی ہے۔ ابتداء میں اس مدرسہ کا کوئی نام نہ تھا، بعد میں یہ مدرسہ اپنے بانی کے نام نامی سے منسوب ہو کر 'مدرسہ رحیمیہ' کہلایا جانے لگا۔ آگے چل کر یہ مدرسہ صرف ایک درس گاہ ہی نہیں رہا، بلکہ برصغیر کی ایک انقلابی تحریک کا مرکز بن گیا۔ اس نے پورے ہندوستان میں انگریزی سامراجیت کی جڑیں کمزور اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے منظّم اقدام کیا ہے۔[۵۹]

اورنگ زیب عالم گیر کے بیٹے شاہ عالم کے عہد میں مدرسہ 'غازی الدین' قائم ہوا۔ غازی الدین اورنگ زیب کے عہد میں ایک محبوب افسر تھے اور ان کا شمار ممتاز لوگوں میں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے دہلی میں اجمیری دروازہ کے پاس ایک مدرسہ، ایک مسجد اور ایک مقبرہ بنوایا، یہ تینوں چیزیں ایک ہی احاطہ کے اندر تھیں۔ اس احاطہ میں طلبہ کی رہائش کے لیے بہت سے کمرے بھی تھے۔ یہی مدرسہ آگے چل کر دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا، جو عیسائی مبلغوں کا مرکز بن گیا تھا۔ پھر یہ کالج ذاکر حسین کالج میں منتقل ہو گیا اور آج اسی نام سے جانا جاتا ہے۔[٦۰]

اسی مدرسہ میں ہندوستان کی معروف اور قابل ہستیوں نے تعلیم حاصل کی، جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آگے چل کر مجاہدین آزادی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ/ ۱۸۳۲-۱۸۸۰ء)، سر سید احمد خاںؒ (۱۲۳۳-۱۳۱۶ھ/ ۱۸۱۷-۱۸۹۸ء)، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (م ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء)، مولانا یعقوب نانوتویؒ (م ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء) منشی ذکاء اللہؒ (م ۱۳۲۸ھ/ ۱۹۱۰ء)، ڈپٹی نذیر احمدؒ (م ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء) ،مولوی کریم الدین پانی پتیؒ، مولوی ضیاء الدینؒ، مولانا احسن نانوتویؒ (۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء)، میر ناصر علیؒ، مولانا فضل الرحمان دیوبندیؒ (۱۳۲۵ھ/ ۱۹۰۷ء) پیرزادہ محمد حسینؒ، مسٹر آصف علی بیرسٹر، ماسٹر جانکی پرشاد، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ (۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء) وغیرہ یہیں کے پروردہ ہیں۔ اس مدرسہ کے اساتذہ میں مرزا احمد، مولوی رشید الدینؒ (۱۲۴۳ھ/ ۱۸۷۴ء) مولوی مملوک علیؒ (۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء) مولانا ضیاء الدینؒ، مولانا امام بخش صہبائیؒ (م ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء) وغیرہ مشہور ہیں۔[۶۱]

ان مدارس کے علاوہ اور بھی بہت سے مدارس تھے جو ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت میں مشغول و منہمک تھے اور مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اسی کے ساتھ علماء و بزرگان دین کی خانقاہیں تھیں جہاں سے تشنگان علم اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ مگر جب انگریزی سامراج کا ہندوستان پر اقتدار قائم ہوا تو حالت یکسر بدل گئی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کے ساتھ ان مدارس و معابد اور قدیم خانقاہوں کو بھی نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

دار العلوم دیوبند کے قیام کے اسباب و محرکات

اگرچہ دہلی کالج (مدرسہ غازی الدین) کو انگریزوں نے اپنے تبلیغی مشن کا محور و مرکز بنالیا تھا، لیکن آگے چل کر یہیں کے اساتذہ اور طلبہ نے ان کے خلاف محاذ آرائی کی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جب انگریزوں کا پورے ملک پر قبضہ ہوگیا اور حکومت نے جگہ جگہ مسلمانوں کے مدارس و معابد پر چھاپے مارے اور انہیں ویران و برباد کیا، تو مذکورہ کالج کے فضلاء اور دیگر ہمدردان ملت نے مل کر اس ناکامی پر سنجیدگی سے غور و خوض کیا اور اس کی تلافی اور مسلمانوں کے تشخص اور اسلامی علوم کی نشر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واشاعت کے لیے ایک ایسے تعلیمی ادارہ کے قیام کو ضروری سمجھا جو گزشتہ تمام ناکامیوں کی تلافی کر سکے اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کی تعلیم وترقی میں اہم کردار ادا کرے۔ چنانچہ اس تحریک کے روح رواں حاجی امداد اللہ (م ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء) اور ان کے رفیق مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند میں ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں ایک مدرسہ کی بنیا درکھی۔ اس مدرسہ کا آغاز چھتہ کی مسجد سے ہوا اور اس کا نام 'دارالعلوم' رکھا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایشیا میں دینی تعلیم کا عظیم ادارہ بن گیا۔ اس کی مقبولیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے 'تاریخ دارالعلوم' کے مصنف محبوب رضوی لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند صرف ایک دینی تعلیم گاہ ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت ایک موثر اور فعال تحریک ہے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کے خس و خاشاک کو جدا کر کے ان کو صاف اور بے میل اسلام سے روشناس کیا۔ شرک اور توہمات سے انہیں نجات دی۔ مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور ڈر کو دور کر کے سیاسی اعتبار سے انہیں اس لائق بننے میں مدد بہم پہنچائی کہ وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر حصہ لے کر مسلمانوں کے قومی وقار کو بلند کر سکیں۔ تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں انہوں نے اپنی عظیم الشان خدمات کا نقش قائم نہ کیا ہو۔ اس تحریک کی افادیت صرف اندرون ملک تک ہی محدود نہیں رہی، بلکہ دور دور تک اس کے حلقۂ اثر کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ اس لیے صرف برصغیر ہی کا نہیں، بلکہ ایشیا کا بھی دارالعلوم دیوبند ایک انقلاب آفریں مرکز بن گیا۔"[۶۲]

اس تعلیمی مرکز نے ایک طرف انگریزوں کے مظالم کو روکنے اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے بڑے بڑے مجاہدین آزادی پیدا کیے تو دوسری طرف یہاں سے ایسے داعیان دین بھی نکلے جنہوں نے عیسائیت کی تبلیغی مساعی پر کاری ضرب لگائی اور اسلام سے متعلق شکوک وشبہات، الزامات اور بہتان تراشیوں کا پردہ فاش کیا۔ اس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقاء کار نے عیسائیوں اور ہندو پنڈتوں سے مختلف مقامات پر مناظرے ومباحثے کیے اور ان کو شکست دے کر اسلام کے رخ زیبا کو تابناکی بخشی۔ انہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے جو مناظرے اور مباحثے کیے وہ کتابی شکل میں 'انتصار الاسلام'، 'تقریر دل پذیر'، 'قبلہ نما'، 'میلہ خداشناسی' اور 'مناظرہ رڑکی' وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔[۶۳]

دار العلوم دیوبند کے فیض یافتہ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تربیت یافتہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (م۱۳۹۳ھ/۱۹۲۰ء) نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے بڑی جدوجہد کی، جس کے نتیجے میں انہیں اذیت ناک سزا سے دوچار ہونا پڑا اور مدتوں مالٹا کی جیل میں قیدوبند کی زندگی گزاری۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور

دار العلوم دیوبند کے اثرات مختصر عرصے میں دور دور تک پھیلے تو ہمدردانِ ملت کے اندر مزید داعیہ پیدا ہوا اور انہوں نے زیادہ سے زیادہ دینی تعلیمی ادارے قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ چنانچہ دار العلوم کے قیام کے تقریباً ۶/ ماہ بعد ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں سہارن پور میں مدرسہ مظاہر علوم قائم ہوا۔[۶۴] اس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتوی نے رکھی۔[۶۵] اس مدرسہ کے قیام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارن پوری، جو مسلم الثبوت فقہا میں تھے، اپنے دولت کدہ پر قدیم رواج کے موافق شائق طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا عنایت الٰہی صاحب، مولانا الحاج قمر الدین صاحب جو آج مشائخ وقت ہیں، اس زمانہ میں حضرت مولانا سعادت علی صاحب کے پاس طالب علمی کے منازل طے کر رہے تھے اور مولانا کے مخصوص تلامذہ میں سمجھے جاتے تھے۔ مولانا کو اکثر دینی مدرسہ کی بنیاد کا ولولہ رہتا تھا اور گاہ بہ گاہ اس کا ذکر تذکرہ بھی فرماتے رہا کرتے تھے۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کے علم میں اس کے لیے یکم رجب المرجب ۱۲۸۳ھ کی تاریخ مقرر تھی۔ چنانچہ عرصہ کے ذکر تذکرہ اور تمنا و خواہش کے بعد دفعۃً تاریخ مذکور میں مولانا کو جوش و ولولہ پیدا ہوا اور چوک کی مسجد میں مدرسہ کی بنیاد ڈال دی۔ مولانا سخاوت علی انبہٹوی کو جو پہلے انبہٹہ میں پڑھایا کرتے تھے...... مدرس عربی مقرر فرمایا، جنھوں نے مولانا عنایت علی صاحب، حافظ الحاج قمر الدین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاحب، محمد علی مقبول احمد صاحب وغیرہ طلبا کونحو میر شروع کرائی۔ان لوگوں کے کچھ اسباق مولانا سعادت علی صاحب کے پاس بھی متفرق طور پر ہوتے تھے، جو مولانا نے خود ہی پڑھانے شروع فرما دیے تھے...... مدرسہ کی بنیاد پڑتے ہی متفرق نواح سے طلبا کی رجوعات شروع ہوئیں۔اس بنا پر مولانا کو ایک مدرس کا فوراً اضافہ کرنا پڑا۔ چنانچہ شوال ۱۲۸۳ھ سے حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز مدرس مقرر ہوئے۔'' ؁۶۶

اس مدرسہ کا طرزِ تعلیم دیو بند جیسا تھا، اور جس کی بنیاد خاص طور سے نظامی نصاب پر رکھی گئی تھی۔ البتہ یہاں ایک خاص انداز میں علم حدیث کو پڑھانے پر زور دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسہ نے علم حدیث کی تعلیم اور اشاعت کے میدان میں نمایاں خدمت انجام دی اور کئی معرکہ آرا کتابیں حدیث پر تحریر کر کے اس علم کو زندہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس مدرسہ کے سرپرستوں اور نگراں اعلیٰ میں مولانا محمد علی، مولانا مظہر، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حافظ سید عبد اللطیف، مولانا اسد اللہ، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا بدر عالم، مولانا عبد الرحیم رائے پوری اور شیخ الحدیث مولانا زکریا کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ؁۶۷

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں مولانا محمد علی مونگیری (۱۲۶۲-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) کی دعوت پر کانپور میں علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین طالب آبادی، مولانا اشرف علی تھانوی (م۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء)، مولانا خلیل احمد سہارن پوری (م۱۳۴۶ھ/ ۱۹۲۷ء)، مولانا ثناء اللہ امرتسری (م۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) مولانا محمود حسن، حکیم فخر الحسن گنگوہی، شاہ سلیمان پھلواروی (م۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء) اور دوسرے علماء شریک ہوئے۔ ؁۶۸ اس اجتماع میں مذہبی تعلیم کے موجودہ طریقے کو بہتر بنانے، مذہبی تعلیم دینے والے مختلف تعلیمی اداروں کے درمیان خیر سگالی لانے اور لائق علماء کے مختلف طبقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے طور طریقوں پر غور کیا گیا۔ان کے سامنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصد یہ تھا کہ ایسے علماء تیار کیے جائیں جو دنیا کے سامنے موثر طریقہ پر اسلام کی تصویر کو پیش کر سکیں۔٦٩ نتیجہ میں ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا اور فیصلہ کیا گیا کہ اس میں نہ صرف مذہبی اور زمانی علوم کی تعلیم کا انتظام ہو بلکہ ٹیکنیکل ٹریننگ کا بھی بندوبست ہو۔ بنیادی مذہبی پہلوؤں کے ساتھ کسی سمجھوتہ کے بغیر تعلیم کے جدید رجحانات کی روشنی میں نصاب تعلیم تیار ہو۔تاکہ طلبا اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ وقت کے تقاضوں کو بھی پورا کریں۔٧٠ دارالعلوم ندوۃ العلما نے تو کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی ،مگر اس 'تحریک' کو، جس کے لیے اس مدرسہ کا قیام عمل میں آیا تھا،بہت زیادہ وسعت اور عمومیت حاصل نہ ہو سکی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

"اس تحریک کو قدیم وجدید دونوں طبقوں کا (اس وسیع خلیج کی وجہ سے جوان کے درمیان حائل تھی) وہ موثر و پرجوش تعاون حاصل نہ ہو سکا جس کی وہ مستحق تھی، اس کا بڑا سبب ان اہل فکر و اہل دعوت کی کمی تھی جو ان دونوں ثقافتوں کے حامل ہوں اور دونوں کو اچھی طرح ہضم کر چکے ہوں اور ان اجزا سے جو بہ ظاہر متضاد نظر آتے ہیں، ایک پاکیزہ، معتدل، خوش گوار اور مفید 'آمیزہ' بنا سکتے ہوں جس طرح شہد کی مکھی مختلف پھولوں اور درختوں سے حاصل کر کے شہد تیار کرتی ہے۔"٧١

اس تحریک کے اثرات ونتائج سے ہٹ کر دارلعلوم ندوۃ العلما کے مقصد قیام پر غور کیا جائے تو یہ فیصلہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے کہ اس نے دینی نظام تعلیم کی قدامت سے پرے ہو کر جدید اسلوب میں اسے امت مسلمہ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بانیان اور فضلاء نے نہ صرف درس وتدریس میں نیا انداز اپنایا، بلکہ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی مثبت فکر کی عکاسی کی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

"ندوۃ العلما کی تحریک کے رہنماؤں اور اس درس گاہ کے متعدد فضلاء نے اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت ،سیرت نبوی کی تحریر وتدوین ،اسلام کے کارناموں اور اس کی تعلیمات کو جدید علمی اور ادبی اسلوب میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ علامہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شبلی نعمانی (۱۲۷۳ھ-۱۳۳۲ھ/ ۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کی علمی و ادبی تحریرات بالخصوص ان کی عظیم کتاب سیرت النبی، الفاروق، الغزالی، مولانا جلال الدین رومی اور ان کے متکلمانہ اور مورخانہ مضامین نے ہندوستان کی جدید نسل کو متاثر کیا اور اس کے احساس کہتری کے دور کرنے میں مفید خدمت انجام دی۔ اسی طرح ان کے شاگرد رشید و جانشین مولانا سید سلیمان ندوی کی خدمات اور ان کے علمی کارناموں سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ’سیرت النبی‘ کی چار جلدیں سیرت نبوی اور علم کلام کا ایک قیمتی کتب خانہ ہے۔ ان کی کتاب ’خطبات مدراس‘ سیرت کی موثر ترین کتابوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اسی طرح ان کے محققانہ علمی و ادبی مضامین نے اسلامی کتب خانہ کو مالامال کیا۔ انہوں نے اور ان کے بعض رفقا نے ملک کی علمی، ادبی اور بعض اوقات سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ جس سے اس الزام کی تردید ہوئی کہ علما ملک کی عام زندگی، جدید تحریکوں اور سرگرمیوں سے کنارہ کش رہتے ہیں اور ان میں جدید رجحانات کے سمجھنے اور ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے کی صلاحیت نہیں۔ دارالمصنفین اور اس کا ماہ نامہ معارف (جو عرصہ دراز تک مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں نکلا) عالم اسلام میں خاصی شہرت اور عزت رکھتے ہیں۔‘‘ ۲۷

دارالحدیث رحمانیہ دہلی

مذکورہ مدرسے قائم تو ہوئے قرآن وسنت کی احیاء اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے، لیکن متعارف ہوتے تھے حنفی مسلک کی ترجمانی کے لیے۔ تاہم ان مدرسوں میں دوسری فکر کے طلبا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ضرورت تھی کہ کوئی ایسا مرکزی مدرسہ قائم ہو جو بطور خاص مسلک اہل حدیث کے لیے ہو۔ چنانچہ امیر المجاہدین صوفی عبدالرحمٰن وزیر آبادی (م ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء) کی مساعی سے دہلی میں دارالحدیث رحمانیہ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء کو باڑہ ہندوراؤ دہلی میں قائم ہوا۔ علامہ عبدالعزیز رحیم آبادی (م ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء) کی ایما پر مشہور تاجر شیخ عبدالرحمٰن (م ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) اور ان کے بھائی شیخ عطاء الرحمٰن (م ۱۳۵۷ھ/

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۳۸ء) نے اپنے خرچ سے اس کی تعمیر و ترقی کا بیڑا اٹھایا۔ چوں کہ دونوں بھائی جماعت مجاہدین کے سالاروں میں سے تھے، اس لیے اس نیک کام کو انجام دینے میں انہوں نے کوئی تامل نہ کیا۔ انہی دنوں مولانا ابراہیم میر سیال کوٹی (م ۱۳۷۵ھ/ ۱۹۵۵ء) دہلی میں ایک مدرسہ چلا رہے تھے۔ جب ان کو اس مدرسہ کے قیام کی خبر ملی تو انہوں نے اپنے مدرسہ کو اس کے تمام ساز و سامان اور لائبریری کے ساتھ اس مدرسہ میں ضم کر دیا۔ چوں کہ دونوں بھائی کے ساتھ رحمٰن کا لفظ لگا ہوا تھا، اس لیے انہیں دونوں بھائیوں کے نام سے اس مدرسہ کا نام 'رحمانیہ' رکھا گیا۔

اس مدرسہ میں ادنی سے آٹھویں جماعت تک منقولات و معقولات کی بڑی ٹھوس تعلیم ہوتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کو ایسی شہرت ملی کہ نہ صرف ہندوستان کے ہر خطہ سے، بلکہ بیرون ملک نجد و حجاز وغیرہ سے بھی طلبا یہاں پڑھنے آنے لگے۔ اس مدرسہ نے کتاب و سنت اور علم دین کی اشاعت کے لیے ملک میں بڑے اچھے اور لائق علماء پیدا کیے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے حادثے کی وجہ سے یہ مدرسہ بند ہو گیا تو اس کی لائبریری اور عمارت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے حصے میں آئی۔ اس مدرسہ کے بعض فارغین کی مساعی سے بعد کے ادوار میں مختلف مقامات پر سلفی ادارے قائم ہوئے۔

مولانا ابراہیم سیال کوٹی، شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی (م ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء)، مولانا غلام یحیی پنجابی کان پوری، مولانا عبدالرحمٰن، مولانا عبداللہ ندوی، مولانا عبدالغفور جے راج پوری، مولانا عبدالحکیم ٹونکی (م ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء)، مولانا سکندر علی ہزاروی، مولانا محمد اسحاق، مولانا محمد احمد (م ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۸ء)، بن ملا حشام الدین (م ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء) مولانا عبدالسلام مبارک پوری (م ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۳ء)، مولانا عبدالصمد مبارک پوری، مولانا نذیر احمد املوی (م ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء) شیخ الحدیث مولانا عبدہ الفلاح (۱۴۲۰ھ/ ۱۹۹۹ء)، مولانا بشیر مبارک پوری، مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری (م ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء) وغیرہ نے یہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر علوم اسلامیہ کے فروغ و اشاعت کا فریضہ انجام دیا ہے۔ [۳۷]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاتمہ:

الحمد للہ موجودہ دور میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں دینی تعلیم کے ادارے موجود ہیں۔ یہ ادارے مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ہر سطح کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت تسلسل ہے اس چیز کا کہ مسلمانوں نے ہر دور میں دینی تعلیم سے دل چسپی لی ہے اور دینی مدارس کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اس معاملے میں دیگر ممالک کی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی پیچھے نہیں رہے ہیں۔ گزشتہ سطور میں جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں وہ اس کا پختہ ثبوت ہیں۔

حواشی ومراجع

۱۔ شاہ معین الدین احمد ندوی، مقالات سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء، ج:۲، ص:۱

۲۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مقالات سلیمان، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ج:۱، ص:۱۰-۱۱

۳۔ ضیاء الحسن فاروقی، مسلمانوں کا نظام تعلیم، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص:۴۵
عبدالرزاق کان پوری، نظام الملک طوسی، نامی پریس، کان پور، ۱۹۱۲ء، ص:۲۴۱
علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ج:۳، ص:۳۸

۴۔ قاسم فرشتہ ہندوشاہ، تاریخ فرشتہ، مکتبہ ملت، دیوبند، ۱۹۸۳ء، ج:۱، ص:۱۲۳ ۵۔ ایضا، ص:۱۳۲

۶۔ شمس تبریز، عربی ادب میں اسلام کا حصہ، نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۹ء، ص:۶۷

۷۔ تاریخ فرشتہ، ج:۱، ص:۱۷۲

۸۔ عبدالحی الحسنی، نزہۃ الخواطر فی بھجۃ المسامع والنواظر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء، ج:۱، ص:۵۷

۹۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۸۴ء، ج:۲۰، ص:۱۸۰ ۱۰۔ ایضا

۱۱۔ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص:۹۵

۱۲۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ادبی دنیا ٹیا محل، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص:۱۱۵

۱۳۔ ایس۔ ایم۔ جعفر، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء، ص:۳۴

۱۴۔ ریاست علی ندوی، اسلامی نظام تعلیم، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۸۴ء، ص:۴۶

۱۵۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج:۲۰، ص:۱۸۰

۱۶۔ امداد صابری، دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، صابر اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص:۶۱
عبدالحی الحسنی، الہند فی العہد الاسلامی، مطبوعہ دارالعرفات، رائے بریلی، ۲۰۰۱ء، ص:۳۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۷۔ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء، ص:۱۸
۱۸۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۱۰۱
۱۹۔ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص:۶۱۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم مملوکیہ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص:۱۷۴-۱۷۵
۲۰۔ ایضاً، ص: ۳۵ ۲۱۔ ایضاً، ص: ۳۷
۲۲۔ تاریخ فرشتہ، ج:۱، ص:۳۹۳ ۲۳۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۳۸
۲۴۔ تاریخ فرشتہ، ص:۳۹۲ ۲۵۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۱۸
۲۶۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص:۳۵۳-۳۵۴
۲۷۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۴۲
۲۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲۰، ص:۱۸۲
۲۹۔ ایضاً، ص:۴۲۔ الہند فی العہد الاسلامی، ص:۳۵۹
۳۰۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۱۹-۲۰
۳۱۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۴۲
۳۲۔ ایضاً، ص:۴۳۔ الہند فی العہد الاسلامی، ص:۳۵۹۔ مولوی ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان، مطبوعہ علی گڑھ، ج:۲، ص:۲۰۸،
۳۳۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۳۴
۳۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج:۲۰، ص:۱۸۲
۳۵۔ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص:۸۶-۸۷
۳۶۔ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص:۲۲
۳۷۔ عبدالمجید سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ص:۴۶
۳۸۔ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص: ۹۵
۳۹۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۹۸
۴۰۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، فرید بک ڈپو، دہلی، ص:۴۹۲
۴۱۔ تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ص:۹۹
۴۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ (مرتب: مالک رام) ساہتیہ اکادیمی، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص:۲۶۳-۲۶۴
۴۳۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص:۲۱۸-۲۱۹
۴۴۔ ہاشم علی خافی خاں، منتخب اللباب، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۳ء، ج:۱، ص:۲۴۹
۴۵۔ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص:۹۹
۴۶۔ ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ، تاریخ شاہ جہاں (مترجم اردو: ڈاکٹر سید اعجاز حسین) قومی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص: ۳۰۶

۴۷ دیکھئے راقم کا مضمون: 'شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی: اصلاحی وتجدیدی خدمات کی روشنی میں'، مجلّہ دراسات دینیہ، ۲۰۰۵ء، فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص: ۱۵۲

۴۸ سید محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند، مطبوعہ دار العلوم دیوبند، ۱۹۹۲ء، ج: ۱، ص: ۷۷

۴۹ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص: ۲۳

۵۰ تاریخ دار العلوم دیوبند، ص: ۷۷، ج: ۱۔ الہند فی العہد الاسلامی، ص: ۳۶۰

۵۱ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج: ۲۰، ص: ۱۸۵

۵۲ تاریخ شاہ جہاں، ص: ۳۰۶ ۵۳ مسلم ثقافت ہندوستان میں، ص: ۲۲۳

۵۴ کاظم شیرازی، عالم گیرنامہ، مطبوعہ کلکتہ، ۱۹۶۸ء، ج: ۲، ص: ۸۶-۸۵

۵۵ محمد علی خاں، مراۃ احمدی، نامی گرامی فتح الکریم ممبئی، ۱۳۰۷ھ، ج: ۱، ص: ۲۷۲

۵۶ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج: ۲۰، ص: ۱۸۵

۵۷ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص: ۳۸ ۵۸ تاریخ دار العلوم دیوبند، ج: ۱، ص: ۹۷

۵۹ دہلی کے قدیم مدارس اور مدرس، ص: ۱۱۳-۱۲۰

۶۰ ایضاً، ص: ۱۲۳۔ دار العلوم دیوبند، ص: ۸۰ ۶۱ ایضا

۶۲ ایضا، ج: ۱، ص: ۱۴۱ ۶۳ ماہ نامہ الرشید لاہور، "دار العلوم دیوبند نمبر"، ص: ۴۷۰-۴۸۰

۶۴ تاریخ دار العلوم دیوبند، ج: ۱، ص: ۴۶۵

۶۵ مولانا عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید، مکتبہ الشیخ، سہارن پور، ج: ۱، ص: ۲۴۶

۶۶ شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی، تاریخ مظاہر، کتب خانہ اشاعت العلوم، سہارن پور، ۱۳۹۲ھ، ج: ۱، ص: ۵-۶

۶۷ ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، ص: ۳۷-۳۸

۶۸ محمد ثانی حسنی ندوی، حیات خلیل، مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنو، ج: ۱، ص: ۱۶۶-۱۶۷

۶۹ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء، ص: ۲۹۸-۲۱۴

۷۰ ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، ص: ۳۰

۷۱ سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۸۱ء، ص: ۹۳

۷۲ ایضاً، ص: ۹۴-۹۵

۷۳ مجلّہ اہل حدیث، یادگار مجلّہ بموقع اٹھائیسواں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس، پاکوڑ، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۹۹-۳۰۲، مرکزی جمعیت اہل حدیث، دہلی

☆☆☆

© rasailojaraid.com